بکذا بُشرًا (نصر سے) سے متعدی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہیں۔ "......کو...... سے خوش کرنا" اور (۴) "بشِر بشَرًا بکذا" (باب ضرب اور سمع سے) بمعنی "...... سے خوش ہونا" آتا ہے جب کہ (۵) بشُر بشارۃً (باب کرم سے) سے "خوبصورت ہونا" کے معنوں میں آتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے (کسی باب سے اور کسی معنی کے لیے) فعل کا کوئی صیغہ کہیں مستعمل نہیں ہوا۔ اس مادہ سے زیادہ تر افعال باب تفعیل سے (۳۸ جگہ)، باب مفاعلہ سے (صرف دو صیغے) باب استفعال سے (چھ جگہ) اور باب افتعال سے (صرف ایک صیغہ) آئے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر مشتقات سٹھ سے زیادہ مقامات پر آئے ہیں۔

زیر مطالعہ لفظ "بَشِّرْ" اس مادہ (بشر) سے باب تفعیل کا فعلِ امر۔ صیغہ واحد مذکر حاضر ہے۔ اور اس باب سے فعل "بَشَّرَ...... یُبَشِّرُ تبشیرًا" کے معنی ہیں "...... کو خوشخبری سنانا" — ایسی خبر سنانا جس سے اس کے چہرے پر "بِشْر" (خوشی کے آثار) ظاہر ہوں"۔

اس طرح یہ فعل متعدی استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفعول (جسے خوشخبری دی جائے) بغیر کسی صلہ کے (بنفسہٖ) منصوب آتا ہے۔ اور جس چیز کی خوشخبری دی جائے اس پر یا تو باء (بِ) داخل ہوتی ہے (شروع میں لگتی ہے) یا "اَنَّ" سے شروع ہونے والا ایک جملہ ہوتا ہے جو دراصل "بِاَنَّ" ہی ہوتا ہے۔ یعنی اس "اَنَّ" سے پہلے ایک (بِ) مقدر ہوتا ہے جیسے آیت زیر مطالعہ میں ہے۔ اور یہ استعمال بھی قرآن کریم میں صرف اسی ایک جگہ آیا ہے۔ ورنہ یہ دوسرا مفعول (جس کی خوشخبری دی جائے) ہر جگہ (قریباً ۳۶ جگہ) یا تو "بِ" کے ساتھ مذکور رہا یا پھر مذکور ہی نہیں ہوا یعنی محذوف ہوتا ہے۔

● اس فعل (بَشَّرَ) کے ساتھ "بِ" یا "اَنَّ" کے استعمال کے سلسلے میں اصول یہ ہے کہ اگر کلام طویل ہو جائے تو یہ "بِ" حذف کرنا جائز

© rasailojaraid.com

ہے مگر مختصر کلام میں یہ حذف ناجائز ہے۔ مثلاً " بَشَّرَهٗ بِاَنَّ لَهُ الْجَنَّةَ" کو " بَشَّرَهٗ اَنَّ لَهُ الْجَنَّةَ " کہنا درست ہے مگر " بَشَّرَهٗ بِالْجَنَّةِ" کو " بَشَّرَهُ الْجَنَّةَ " کہنا غلط ہے۔ آگے چل کر اس فعل کے " باء " کے حذف یا اثبات کے ساتھ استعمال کی کئی مثالیں سامنے آئیں گی۔

● " تبشیر " کے بنیادی معنی " اچھی خبر دینے " کے ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی طنزاً اور تہکماً " دوزخ کی خوشخبری دینا " یا " عذاب کی خوشخبری دینا" کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

[اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا] " اَلَّذِیْنَ " اسم موصول برائے جمع مذکر بمعنی " وہ لوگ جو کہ / ان لوگوں کو جو " ہے اور فعل " آمنوا " کا مادہ " ا م ن " اور وزن " اَفْعَلُوْا " ہے۔ یعنی یہ فعل " آمن یُؤْمِنُ اِیْمَانًا " (باب افعال) سے فعل ماضی معروف کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ یعنی " وہ ایمان لائے " یہاں " اٰمَنُوْا " بغیر صلہ (بِ یا لِ) کے آیا ہے۔ اس لیے کہ اصطلاحی معنی میں یہ بات موجود ہے کہ کن چیزوں پر ایمان مراد ہے یعنی " توحید، رسالت، آخرت وغیرہ پر ایمان لائے " ۔ جن امور پر ایمان لانا اسلام کی بنیاد کی پہچان ہے۔ " الذین " کی مزید وضاحت کے لئے الفاتحہ : ۷ یعنی ۱:۶:۱(۱) اور " آمنوا " کے مادہ، فعل مجرد، باب اور معانی کی مزید وضاحت کے لیے البقرہ : ۳ یعنی ۲:۲:۱(۱) کی طرف رجوع کیجئے۔

۲:۱۸:۱(۲) [وَعَمِلُوْا] میں " وَ " تو عاطفہ بمعنی " اور " ہے ــ اور " عَمِلُوْا " کا مادہ " ع م ل " اور وزن " فَعِلُوْا " ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " عَمِلَ ... یَعْمَلُ عَمَلاً " (باب سمع سے) آتا ہے۔ اور اس کے معنی (۱) (کوئی کام) کرنا (۲) (عمل) کرنا (۳) (محنت) کرنا (۴) (کام) سر انجام دینا (۵) .... کو تیار کرنا (۶) .... کو بنانا اور (۷) .... کو بجا لانا۔

ہوتے ہیں ۔ یہ فعل متعدی ہے اور اکثر اس کے ساتھ اس کا مفعول (بنفسہٖ) مذکور ہوتا ہے ۔ بعض اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ "باب سمع" سے یہ واحد فعل ہے جس کا مصدر "فَعَلٌ" کے وزن پر آتا ہے ۔ ورنہ عموماً (اس باب کے مصدر کا وزن) "فَعْلٌ" آتا ہے ۔

● اردو میں خود لفظ "عمل" متعارف اور متداول ہے اس لیے اس کا ترجمہ "عمل کرنا" بھی استعمال ہوتا ہے ۔ "عَمِلَ یعمَلُ" مطلقاً اچھے یا برے ہر قسم کے کام کے (کرنے) لیے آتا ہے ۔ اچھے یا برے کی تمیز عبارت یا اس کے سیاق و سباق سے ہوتی ہے ـــ عربی زبان کے دو لفظ "عَمَلٌ" اور فِعْلٌ (فَعَلَ یَفْعَلُ فِعْلاً) سے) قریباً ہم معنی ہیں اور اردو میں دونوں کا ترجمہ "عمل" اور "فعل" کے علاوہ "کام" سے کیا جاتا ہے ۔ تاہم "عَمِلَ یعمَلُ" کے معنی عموماً "کام کرنا" ہوتے ہیں اور "فعَلَ یفعَلُ" کا ترجمہ صرف "کرنا" کیا جاتا ہے ۔ اس فرق کو راغب (مفردات میں) اور بعض دیگر اہل لغت نے یوں سمجھایا ہے کہ "عمل" میں قصد، ارادہ اور کوشش (سے کرنے) کا مفہوم شامل ہوتا ہے جب کہ "فعل" "عمل بلاقصد" کو بھی کہتے یعنی "فعل" "عمل" سے زیادہ عام ہے یا عمل فعل سے زیادہ خاص ہوتا ہے ۔

یہ فعل (عمِل یعمَل) قرآن کریم میں کثیر الاستعمال ہے ۔ صرف ثلاثی مجرد سے ہی اس کے مختلف صیغے ۲۷۵ جگہ آئے ہیں اور اسماء، مصادر اور دیگر مشتقات ۸۰ سے زائد مقامات پر وارد ہوئے ہیں ۔ اور موقع استعمال کے لحاظ سے اس فعل کے مختلف معنوں کا (جو اوپر بیان ہوئے ہیں) تعیّن ہوتا ہے ۔

۱۸: ۱ : (۳) [ الصّٰلِحٰتِ ] جس کی عام عربی املاء "الصالحات" ہے ۔ اس کا مادہ "ص ل ح" اور وزن (لام تعریف کے بغیر) اور بصورت رفع "فاعلاتٌ" ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "صلَحَ یصلُحُ صلاحًا" (عموماً باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں : "ٹھیک ٹھاک ہونا، خرابی یا برائی سے

© rasailojaraid.com

سے پاک ہونا، قابل ہونا یا صلاحیت والا ہونا" اور اس طرح اس میں "نیک ہونا" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سے اسم الفاعل مذکر "صالحٌ" بمعنی نیک مرد اور مؤنث "صَالِحَۃٌ" بمعنی نیک عورت آتا ہے۔ اور لفظ "صالحۃٌ" نیک عمل اور اچھے کام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر تو "صالح" یا "صالحۃ" صفت کا کام دیتے ہیں۔ اور نیک عمل (واحد کے لیے) "عمل صالحٌ" (نیک کام) اور "نیک اعمال" (جمع کے لیے) "اعمالٌ صالحۃٌ" یا "اعمالٌ صالحاتٌ" کہہ سکتے ہیں۔ پھر جمع مؤنث کا موصوف حذف کر دیتے ہیں۔ اور "الصالحات" سے مراد ہی یا تو "النساء الصالحات" یعنی نیک عورتیں ہوتی ہیں یا "الاعمال الصالحات" یعنی نیک اعمال یا صرف "نیکیاں" مراد ہوتی ہیں۔ یہ لفظ (الصالحات) بمعنی نیک عورتیں تو قرآن کریم میں صرف ایک جگہ (النساء : ۳۴) آیا ہے اور بمعنی نیک اعمال یا "اچھے کام" ساٹھ سے زیادہ جگہ آیا ہے۔

● اس مادہ (ص ل ح) سے فعل ثلاثی مجرد کا بھی صرف ایک ہی صیغہ (صَلَحَ) صرف دو جگہ (الرعد : ۲۳ اور المؤمن : ۸) آیا ہے۔ مزید فیہ میں سے صرف باب اِفعال کے مختلف صیغے ۲۸ جگہ آتے ہیں۔ اور مجرد و مزید فیہ سے اسماء مشتقہ وغیرہ کے مختلف الفاظ پچاس کے قریب مقامات پر وارد ہوتے ہیں۔

[اَنَّ لَهُمْ] "اَنَّ" کے معنی "بے شک" یقیناً اور "لهم" کا ترجمہ "اُن کے لیے" ہے یعنی "بے شک اُن کے لیے ہیں / ہوں گے" (کیونکہ آگے جمع کا صیغہ آرہا ہے)۔

۱:۱۸:۱ (۴) [جَنّٰتٍ] جس کی عام عربی املاء "جنات" ہے۔ اس کا مادہ "ج ن ن" اور وزن "فَعْلَاتٌ" ہے۔ یعنی اس کی اصلی شکل "جَنْنَات" تھی پھر دونوں "ن" مدغم ہو گئے۔ اور یہ (جنات) "جَنَّۃٌ" بر وزن فَعْلَۃ" کی جمع مؤنث سالم ہے۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "جَنَّ ...... یَجُنُّ جَنَانًا" (عموماً باب نصر سے) آتا ہے۔ اور اس کے معنی ہیں ...... کو چھپا لینا، ...... کو ڈھانپ لینا" یعنی یہ فعل متعدی ہے اور کبھی (باب ضرب سے) "جَنَّ یجِنُّ جَنًّا" بطور فعل لازم بمعنی

"پوشیدہ ہونا، چھپنا" بھی آتا ہے (تاہم یہ استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا) اور بطور فعل متعدی اس کا مفعول بنفسہ بھی آتا ہے اور "علی" کے صلہ کے ساتھ بھی۔ یعنی "جَنَّہٗ و جنَّ علیہ" (اس نے اس کو ڈھانپ لیا)۔ اور اگر اس فعل کا فاعل "اللیلُ" کسی مفعول کے ذکر کے بغیر آئے مثلاً "جنَّ اللیلُ" تو اس کے معنی "تاریک ہونا" ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے فعل ماضی کا ایک ہی حرف ایک جگہ (الانعام : ۷۶) آیا ہے اور وہ بھی "علی" کے صلہ کے ساتھ۔ اس مادہ سے فعل مجرد بصورت مجہول "جُنَّ الرَّجلُ جُنونا" پاگل ہو جانا" کے معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس سے بھی فعل کا کوئی صیغہ نہیں آیا۔ البتہ اس مادہ (جنن) سے مختلف اسماء اور مشتقات کے مختلف صیغے دو سو (۲۰۰) سے زائد جگہ وارد ہوئے ہیں۔

اہل لغت نے اس مادہ (جنن) کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ اس سے مشتق ہونے والے تمام افعال و اسماء میں چھپنے یعنی "پوشیدگی" کا مفہوم موجود ہوتا ہے جیسے: الجِنُّ، جُنَّۃ (ڈھال)، جَنَّۃ (گھنا باغ)، اَجِنَّۃ (جَنِین کی جمع)، مجنونٌ، جِنَّۃٌ (جن) وغیرہ۔ اور یہ کلمات تو قرآن کریم میں آئے ہیں جن پر حسب موقع بات ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔

قرآن میں استعمال نہ ہونے والے مگر پوشیدگی کی خصوصیت کے مظہر الفاظ میں سے الجَنَن (قبر)، المِجَنّ (ڈھال)، الجَنِین (بچہ جو ابھی ماں کے پیٹ میں ہو) نیز الجنین (قبر میں مدفون) اور الجَنَان (قلب، دل) قابل ذکر ہیں[1]۔ "جَنَّۃٌ" کے اصل بنیادی معنی بھی ایسا "گھنا باغ" ہے جس کی زمین سورج کی شعاعوں سے پوشیدہ رہے یا جس کی چھاؤں نے زمین کو چھپا رکھا ہو۔ بعض اہل زبان "جَنَّۃ" صرف اس باغ کو کہتے ہیں جس میں انگور اور کھجور کے پودے اور درخت موجود ہوں۔ ورنہ اسے صرف "حدیقۃ" کہتے ہیں[2]۔

---

[1] دیکھئے اعراب ثلاثین سورۃ (لابن خالویہ) ص ۲۴۰ و ۲۴۱ -

[2] دیکھئے البستان مادہ "جنن"

© rasailojaraid.com

● قرآن کریم میں یہ لفظ ( "جَنَّۃ" یا اس کی جمع "جنّات" ) مطلقاً باغ یا باغات کے معنی میں بھی آیا ہے۔ تاہم زیادہ تر اس سے مراد وہ باغ (الجنّۃ) یا باغات (جنات) ہیں جن کا آخرت (مابعد الموت زندگی) میں نیک لوگوں کو ملنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ (اور ان معنوں میں یہ لفظ بصورت واحد یا جمع ایک سو بیس کے قریب مقامات پر مذکور ہوا ہے) ۔ اور اس لحاظ سے یہ ایک خاص اسلامی اصطلاح ہے۔ اور اس کا ترجمہ عموماً فارسی لفظ "بہشت" سے کیا جاتا ہے جس کے اصل معنی چاہے کچھ تھے (ایران میں " اردی بہشت" ایک مہینے کا نام بھی ہے) مگر اب وہ لفظ " الجنّۃ " کے مترادف (IDENTICAL) بن چکا ہے ۔ اور خود لفظ " جنّت" بھی اپنے ان ہی اصطلاحی معنی کے ساتھ اردو میں بھی مستعمل ہے ۔ اس لفظ کے عام لغوی معنی اور اصطلاحی معنی کا تعیّن عبارت کے اندر سیاق و سباق سے ہو جاتا ہے۔

۱۸:۲ : ۱ (۵) [تَجۡرِیۡ] کا مادہ "ج ر ی" اور وزن اصلی " تَفۡعِلُ " ہے۔ اور اس کی اصلی شکل " تَجۡرِیُ " تھی جس میں آخری یاء (ی) اپنے ماقبل کے مکسور ہونے کی بناء پر ساکن ہو جاتی ہے ۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "جرَی یجرِی جَرۡیًا و مَجۡرًی" (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی تو "پانی کا بہنا بلکہ تیزی سے بہنا" ہیں۔ پھر اس سے اس میں "گزرنا ، رواں ہونا ، جاری ہونا ، دوڑنا (گھوڑے کا) چلنا (ہوا یا کشتی کا) کے معنی پیدا ہوتے ہیں ۔قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے افعال کے مختلف صیغے ۵۷ جگہ اور مختلف اسماء و مشتقات سات جگہ آئے ہیں ۔ یہاں " تجری " کا ترجمہ " چلتی ہیں' بہتی ہیں/ ہوں گی) بہہ رہی ہیں" سے کیا گیا ہے ۔

۱۸:۲ : ۱ (۶) [مِنۡ تَحۡتِہَا] یہاں ابتدائی " مِنۡ " بمعنی "سے" ہے اور آخری ضمیر مجرور "ھا" کے معنی یہاں " اس کے یا ان کے" ہوں گے ۔ اور لفظ "تحت" کے معنی ہیں " ..... کے نیچے" ۔ اس لفظ (تحت) کا مادہ یہی (ت ح ت) ہی

com
om

ہے۔ اور وزن "فَعُلٌ" ہے۔ تاہم اس مادہ سے عربی زبان میں کوئی فعل استعمال نہیں ہوتا۔ اور لفظ "تحتُ" بھی کبھی معرب استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ظرف مکان کی حیثیت سے ہمیشہ بصورت "تحتَ" مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے۔ کبھی اس سے پہلے "مِنْ" لگتا ہے (جیسے یہاں آیت زیرِ مطالعہ میں ہے)۔ اس صورت میں اسے "من تحتِ....." (آخری تاء کے کسرہ کے ساتھ اور مجرور) پڑھا جاتا ہے۔ کبھی اس کا مضاف الیہ محذوف کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت یہ ضمہ (ـُـ) پر مبنی پڑھا جاتا ہے۔ مثلاً "مِنْ تحتُ" ــــ تاہم یہ آخری استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا۔ (اگرچہ "قبل" اور "بعد" اس طرح مستعمل ہوئے ہیں)۔ البتہ پہلی ــ اضافت والی ــــ دونوں صورتیں "تحتھا" اور "مِن تحتھا" قرآن کریم میں آئی ہیں۔ "تَحْتَ" کبھی بطور اسم آتا ہے اور اس کی جمع "تُحُوتٌ" آئی ہے۔ یہ لفظ قرآن میں تو نہیں آیا مگر حدیث میں علاماتِ قیامت کے سلسلے میں آیا ہے۔ چاہیں تو "القاموس" میں اس کے معنی دیکھ لیجئے۔

<u>۲: ۱۸: ۱ (۷)</u> [ **الْاَنْھٰرُ** ] (جس کا رسم املائی "الانھار" ہے) کا مادہ "ن ھ ر" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "اَفْعَالٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "نھَر ..... ینھَر نَھْرًا" (باب فتح سے) آتا ہے اور اس کے مختلف معنی ہوتے ہیں مثلاً (۱) (پانی کا) زور سے بہنا (۲) پانی کا بہتے ہوئے اپنے لیے راستہ بنانا (۳) زمین کو پھاڑنا یا اتنا کھودنا کہ پانی نکل آئے (۴) زبان سے کسی غصے کا اظہار کرنا، ..... کو جھڑکنا" یعنی یہ فعل لازم متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور متعدی کی صورت میں اس کا مفعول (اگر مذکور ہو تو) بنفسہٖ (منصوب) آتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل مجرّد صرف آخری یعنی (۴) معنی کے لیے اور وہ بھی صرف دو جگہ (الاسراء: ۲۳ اور الضحٰی: ۱۰) آیا ہے۔ یہ فعل اپنے دیگر معانی کے لیے قرآن میں استعمال نہیں ہوا۔

● لفظ "اَنھار" صیغہ جمع (مکسر) ہے اس کا واحد "نَھْرٌ" اور "نَھَرٌ" ہے۔ (قرآن کریم میں صرف دوسری صورت ــ "نَھَرٌ" بفتح الھاء ــــ استعمال ہوئی ہے)۔

© rasailojaraid.com

پہلی صورت " نَھْرٌ " بسکون الھاء ـــ اردو میں عام مستعمل ہے اس لیے " انہار" کا اردو ترجمہ " نہریں " ہی کیا جاتا ہے ۔ البتہ عربی زبان میں لفظ " نَھَرٌ " انسان کی بنائی ہوئی نہر ( CANAL ) کے علاوہ دریا (RIVER) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اور قرآن کریم میں بھی ان دونوں معنی کے لیے آیا ہے ۔

[ كُلَّمَا ] ظرف بمعنی " جب کبھی بھی ، جب بھی " ہے ۔ اس کی بناوٹ ، معنی اور استعمال پر البقرہ : ۲۰ یعنی ۲ : ۱۵ : ۱ (۳) میں بات ہو چکی ہے ۔

[ رُزِقُوْا ] کا مادہ " رزق " اور وزن " فُعِلُوْا " ہے یعنی یہ اس مادہ کے فعل مجرد کا صیغہ ماضی مجہول ( جمع مذکر غائب ) ہے ۔ جس کا ترجمہ تو " ان کو عطا کیا گیا " ہے مگر یہاں " كُلَّمَا " میں معنیٔ شرط کی موجودگی کے باعث اس کا ترجمہ مستقبل کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ یعنی " دئے جائیں گے ، ملے گا ان کو ، ان کو دیا جائے گا ، " کی صورت میں ۔ اس فعل کے باب ، معنی اور استعمال کی بحث کے لیے دیکھئے البقرہ : ۳ یعنی ۲ : ۲ : ۱ (۶)

[ مِنْهَا ] جو حرف جار " مِنْ " بمعنی " میں سے " [ دیکھئے ۲ : ۲ : ۱ (۵) ] اور ضمیر مجرور " ھا " بمعنی " اس کا مرکب ہے یعنی " اس میں سے " ۔

[ مِنْ ثَمَرَةٍ ] کا ابتدائی " مِنْ " حرف الجر بمعنی " میں سے " اور " کی قسم کا " ہے اور " ثَمَرَةٌ " کا مادہ " ث م ر " اور وزن " فَعَلَةٌ " ہے ۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب ، معنی اور استعمال کی وضاحت کے لئے البقرہ : ۲۲ یعنی ۲ : ۱۶ : ۱ (۱۱) کو دیکھئے ۔ جہاں " ثمرۃٌ " کی تائے وحدت اور اسکے ترجمہ کی بات بھی کی گئی ـــ یہاں زیر مطالعہ آیت میں اس تائے وحدت اور مِنْ بیانیہ ( دیکھئے ۲ : ۲ : ۱ (۵) ) کی وجہ سے " مِن ثَمَرةٍ " کا ترجمہ " میووں سے ، کوئی میوہ ، کوئی پھل ، کسی پھل اور کسی قسم کا پھل " کیا گیا ہے ۔

[ رِزْقًا ] کا مادہ " ر ز ق " اور وزن " فِعْلًا " ہے ۔ یہ فعل مجرد

" رَزَقَ یرزُقُ رِزْقًا " ( دیکھئے ۲:۲:۱(۶) ) کا مصدر بمعنی " روزی دینا " بھی ہے اور اسم بمعنی " روزی " بھی ۔ یہاں اس کے ترجمے کا تعین بحث الاعراب میں کیا جائے گا ۔ ( جو ابھی آگے آئے گی ) ۔

[قَالُوْا] کا مادہ " ق و ل " اور وزن اصلی " فَعَلُوْا " ہے ۔ جس کی اصلی شکل " قَوَلُوْا " تھی ۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب ، معنی اور اس میں واقع ہونے والی تعلیل وغیرہ کے بارے میں البقرہ : ۸ یعنی ۲:۷:۱(۲) دیکھئے ۔

[هٰذَا الَّذِیْ] هٰذا = یہ اور الّذی = وہ جو کہ ۔ اس طرح اس ( هٰذا الّذی ) کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے " یہ ہے وہ جو " ، جس کا بامحاورہ ترجمہ بیشتر مترجمین نے " یہ وہی ہے جو ، یہ تو وہی ہے جو ، " کی صورت میں کیا ہے ۔ بعض نے صرف " یہ تو " ہی رہنے دیا ہے ۔ مگر اس میں " الّذی " کا ترجمہ نظرانداز ہو گیا ہے ۔ اسمائے اشارہ ( جن میں سے ایک یہ " هٰذا " ہے ) کا بیان ۲:۱:۱(۱) میں اور اسمائے موصولہ ( جن میں سے " الّذی " بھی ہے ) کا بیان ۱:۶:۱(۱) میں گزر چکا ہے ۔

[رُزِقْنَا] کا مادہ " رزق " اور وزن " فُعِلْنَا " ہے ۔ یعنی یہ اس فعل مجرد کا ( جس پر بات ۲:۲:۱(۶) میں ہو چکی ہے ) ماضی مجہول صیغہ جمع متکلم ہے ۔ جس کا ترجمہ " دئے گئے ہم ، ملا تھا ہم کو ، ہم کو ملا تھا / مل چکا تھا ، ہمیں مل چکا ہے ، " کی صورت میں کیا گیا ہے ۔

[مِنْ قَبْلُ] میں " قبلُ " کا مضاف الیہ محذوف ہے اس لیے اس کا ترجمہ " پہلے ہی یا پہلے بھی " ہو گا ۔ اگرچہ بعض مترجمین نے " اس سے پہلے ' اس سے پیشتر " کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی " مِنْ قبلِ ذلکَ " کی طرح اور بعض نے صرف " قَبْلُ " کا ترجمہ " پہلے " کر دیا ہے ۔ جس میں " مِنْ " کی وجہ سے پیدا ہونے والا زور ( ہی ) موجود نہیں ہے ۔ " قَبْلُ " کے معنی اور استعمال پر البقرہ : ۴ یعنی

© rasailojaraid.com

<u>۲:۳:۱ (۴)</u> میں بات ہو چکی ہے ۔

<u>۲:۱۸:۱ (۸)</u> [ وَ اُتُوۡا بِہٖ ] میں ابتدائی " واو " عاطفہ بمعنی " اور " ہے اور " اُتُوۡا " کا مادہ " ا ت ی " اور وزن اصلی " فُعِلُوۡا " ہے ۔ اس کی اصلی شکل " اُتِیُوۡا " تھی ۔ جس میں واو الجمع سے ماقبل آنے والی " یاء " (جو لام کلمہ ہے) کو ساقط کر دیا جاتا ہے اور پھر اس سے ماقبل کی " تاء " کو (جو عین کلمہ ہے) مکسور ہونے کی وجہ سے مضموم کر دیا جاتا ہے ۔ یہ قاعدہ آپ اب تک بہت سے افعال (مثلاً " اشتروا " ، مَشَوۡا ، فَأۡتُوۡا ، اتّقوا وغیرہ ) میں ملاحظہ کر چکے ہیں ۔

● اس مادہ (اتی) سے فعل مجرد کے باب " اتی یاتی اتیانًا " کے معنی (آنا کرنا وغیرہ ) پر ابھی اوپر <u>۲:۱۷:۱ (۴)</u> میں بات ہو چکی ہے ۔ اس فعل کے ساتھ " بِ " کا صلہ آئے تو اس کے معنی " لانا " ہوتے ہیں ۔ یعنی " اتی بِ ..... " = ..... کو لے آنا ۔ اور اس کے مجہول فعل " اُتِیَ بِ ..... کے معنی (مصدری) ہوں گے " ..... کے پاس لایا جانا " زیر مطالعہ لفظ " اُتُوۡا بِہٖ " اسی فعل ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے ۔ یوں " اُتُوۡا بِہٖ " کا ترجمہ لفظی ہو گا " ان کے پاس لایا گیا وہ (فلاں چیز) " اور اردو مترجمین نے " اُتُوۡا بِہٖ " کا ترجمہ " ان کو وہ دیا ہی جائے گا ، ان کے پاس آئے گا وہ " کیا ہے ۔ اور بعض نے فعل ماضی کے ساتھ ہی ترجمہ کیا ہے یعنی " انہیں دیا گیا وہ " ۔ جب کہ بہت سے حضرات نے یہاں " بہ " کی ضمیر کو محاورے کی خاطر نظر انداز کرتے ہوئے (کیونکہ اس سے اگلے لفظ " متشابھا " میں اس کا مفہوم (بلحاظ محاورہ) شامل ہو جاتا ہے) لہٰذا انہوں نے " اتوا ب ..... " کا ترجمہ " وہ لائے جائیں گے ، ان کے پاس آئے گا ، ان کو دیے جائیں گے ، ملے گا ان کو ، ان کو ملا کریں گے ، ان کو دیا ہی جائیگا ، کے ساتھ کیا ہے ۔ دی یا لائی جانے والی چیز کے لیے (ضمیر " ہ " کا ) بلفظ جمع ترجمہ کرنے کی گنجائش " من ثمرۃ " اور " رزقًا " کے الفاظ میں (بلحاظ مفہوم) نکلتی ہے ۔

۲:۱۸:۱ (۹) [مُتَشَابِهًا] کا مادہ "ش ب ہ" اور وزن "مُتَفَاعِلٌ" (متشابهًا بلحاظ شکل منصوب ہے جس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی)۔
اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد استعمال ہی نہیں ہوتا۔ صرف مزید فیہ کے مختلف ابواب (تفعیل، تفعل، تفاعل، مفاعلۃ اور افتعال) سے مختلف معنوں کے لیے آتا ہے۔
ان میں سے قرآن کریم میں اس مادہ سے صرف تفعیل، تفاعل، اور افتعال سے افعال، اسماء اور مشتقات کے مختلف صیغے ۱۲ جگہ وارد ہوئے ہیں۔

● لفظ "متشابِهٌ" اس مادہ (شبہ) سے باب تفاعل کا صیغہ اسم الفاعل ہے۔ اس باب سے فعل "تشابَهَ یتشابَهُ تشابُهًا" کے معنی ہیں "باہم ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہونا"۔ باب تفاعل کی ایک خصوصیت "مشارکت" ہے۔ یعنی اس میں ہمیشہ کسی کام کے دو فاعلوں کے باہمی فعل کا ذکر ہوتا ہے۔ اس لیے "تشابَهَ الشیئُ" کہنا غلط ہے بلکہ کہیں گے "تشابہَ الشیئانِ" (وہ دو چیزیں باہم ملتی جلتی ہیں) ۔۔۔ یا مثلاً کہیں گے "تشابہ زیدٌ و بکرٌ" یعنی اس فعل کا فاعل ایک نہیں بلکہ دو ہوتے ہیں ۔۔۔ اور اس کے اسم الفاعل (متشابِهٌ) کا ترجمہ بھی صرف "ملنے جلنے والا" نہیں بلکہ "دوسرے سے ملنے جلنے والا"، یعنی "باہم ملتا جلتا" ہوگا۔ اسی لیے مختلف مترجمین نے اس کا ترجمہ "ایک طرح کا، ایک صورت کے، ایک ہی صورت کے، ایک ہی صورت کے، ایک ہی طرح کے، ملتی جلتی صورتیں، ہم شکل اور ملتا جلتا ہوا" کی صورت میں کیا ہے۔ ان سب الفاظ کا مفہوم تو ایک ہی ہے البتہ بلحاظ محاورہ بعض الفاظ دوسروں سے بہتر کہے جا سکتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ بعض مترجمین کا انتخاب الفاظ زیادہ بہتر ہے۔

[وَلَهُمْ فِيهَا] یہ "وَ" (اور) + "لِ" (کے لیے، لام الجر ضمیر کے مفتوح پڑھا جاتا ہے) + "هُمْ" (اُن) + "فِيْ" (میں) + "ھا" (اس) کا مرکب ہے یوں اس کا ترجمہ ہوگا "اور اُن کے لیے اس میں (ہوگا)" اس کی مزید وضاحت "الاعراب" میں آئے گی۔

© rasailojaraid.com

۲:۸: ۱ : (۱۰) [ اَزْوَاجٌ ] کا مادہ " ز و ج " اور وزن " اَفْعَالٌ " ہے۔
یہ جمع کا صیغہ ہے جس کا واحد " زَوْجٌ " بر وزن " فَعْلٌ " ہے۔ اس مادہ
سے فعل ثلاثی مجرد " زاجَ (بینھم) یزُوج زوجًا " (باب نصر سے) آتا ہے ۔
اور اس کے معنی " (کے درمیان) اشتعال پیدا کرنا، لڑائی ڈالنا " ہوتے ہیں ۔
تاہم یہ فعل عربی زبان میں بھی قلیل الاستعمال ہے ۔ حتیٰ کہ بعض معاجم (ڈکشنریوں)
میں اس کے ذکر کو ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ اور قرآن کریم میں تو یہ فعل (مجرد) کہیں آیا
ہی نہیں ـــــ البتہ اس مادہ (زوج) سے باب تفعیل کے کچھ صیغے صرف پانچ
جگہ استعمال ہوتے ہیں ۔ ان پر اپنے موقع پر بات ہو گی ۔ ان شاء اللہ ۔

● لفظ " ازواج " کا واحد " زوج " ہے اور یہ دونوں لفظ واحد،
تثنیہ، جمع، مفرد مرکب، معرفہ نکرہ مختلف حالتوں میں قرآن کریم کے اندر ستر (۷۰)
جگہ آئے ہیں۔

" زَوْج " کے بنیادی معنی ہیں " (کسی چیز کے) جوڑے میں سے ایک " ۔
جب پورا جوڑا مراد لینا ہو تو عربی میں صیغۂ تثنیہ استعمال کرتے ہیں یعنی " زِوجَان "
(بصورت رفع) یا " زَوْجَیْن " (بصورت نصب یا جر) ـــــ زوجین کا
مطلب " دو جوڑے یعنی چار افراد " نہیں ہوتا ۔ بلکہ " پورا جوڑا " مراد ہوتا ہے
مثلاً کہیں گے " زوجا حمامٍ " (کبوتروں کا جوڑا ۔ ایک نر ایک مادہ) یا
" زوجا نِعالٍ " (جوتوں کا جوڑا یعنی دونوں پاؤں کے لیے)۔ اس طرح " زوجین "
کا مطلب " میاں بیوی " بھی ہو سکتا ہے اور " مرد و عورت " بھی۔

● میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے کا " زوج " ہے (اور تمام " جوڑوں "
میں یہی باہمی تعلق ہے یعنی ہر ایک دوسرے (ساتھی) کا زوج ہوتا ہے)۔ اس
لفظ " زَوْج " کا کسی حد تک (یعنی صرف میاں بیوی کی حد تک) مناسب مترادف
انگریزی کا لفظ SPOUSE ہو سکتا ہے ۔ جو شوہر (HUSBAND) اور بیوی
(WIFE) دونوں پر بولا جاتا ہے یعنی ہر ایک دوسرے کا SPOUSE ہے ۔

اور انگریزی میں بھی یہ لفظ ( SPOUSE ) زیادہ تر شاہی جوڑے (ملکہ و بادشاہ اور راجہ ورانی) کے لیے بولا جاتا ہے ـــــ اس کے مقابلے پر عربی کے لفظ " زَوْج " میں بہت زیادہ وسعت ہے ۔ یہ لفظ صرف میاں بیوی اور مرد وعورت کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتا ـــــ بلکہ کسی بھی نر و مادہ کے جوڑے کو ـــــ وہ حیوانات سے ہوں یا نباتات سے ـــــ " زوجَیْن " کہا جاتا ہے ۔ بلکہ یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو " بصورت جوڑا " استعمال ہوتی ہے ۔ جیسے جوتا ( نعل ) ، جراب ( جَورب ) ، دستانہ ( قفّاز ) وغیرہ ۔ یا جن چیزوں کا دو مستقل " ساتھیوں " کے طور پر ذکر کیا جاتا ہو ۔ جیسے دن رات ، کڑوا میٹھا وغیرہ فارسی کا لفظ " ہمسر یا جفت " کسی حد تک ان معنی کے قریب ہے ۔ اردو میں اس قسم کا کوئی ایک لفظ نہیں ہے ۔ لہٰذا عبارت کے سیاق و سباق کی بنا پر اس کا ترجمہ " خاوند " یا " بیوی " یا صرف " جوڑا " کر لیا جاتا ہے اور اس سے مراد دراصل " جوڑے کا ایک فرد ہوتا ہے ۔

● قرآن کریم میں لفظ " ازواج " (بصیغۂ جمع) آٹھ کے قریب مقامات پر تو مطلقاً کسی چیز کے جوڑے یا "جوڑوں" کے معنی میں آیا ہے ۔ اور تین جگہ (البقرہ: ۲۳۰ و ۲۳۲ اور المجادلہ: ۱) " خاوند " اور " خاوندوں " کے معنی میں آیا ہے ۔ ـــــ باقی تمام ـــــ پچاس سے زائد ـــــ مقامات پر یہ لفظ ( ازواج ) یا اس کا واحد ( زَوْج ) بیویوں یا بیوی کے معنی میں آیا ہے ۔ اور ان معنوں میں یہ لفظ اس دنیوی زندگی کے بعض مسائل مثلاً نکاح ، طلاق ، وراثت ، حجاب ، ظہار وغیرہ کے قرآنی احکام کے بیان کے لیے بھی آیا ہے ۔ اور اخروی زندگی کے انعامات کے ضمن میں بھی (کم از کم دس سے زیادہ مقامات پر) مذکور ہوا ہے (اس پر مزید بحث ابھی آگے آ رہی ہے) ۔

● عربی میں بیوی کے لیے لفظ " زوجۃ " بھی استعمال ہوتا ہے (جس کی جمع " زوجات " ہوتی ہے) ۔ بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ[1] بیوی

---

[1] مثلاً دیکھیے "LANE'S LEXICON" تحت مادۂ زوج

© rasailojaraid.com

کے لیے " زوجۃ " کا لفظ صرف نجد کی بولی میں یا بعض دیگر قبائل عرب کے ہاں استعمال ہوتا ہے مگر حرم (مکہ مکرمہ) یا حجاز کے لوگ میاں بیوی دونوں کے لیے " زَوج " ہی استعمال کرتے ہیں۔ (جس کی جمع ازواج ہے) اور اس مقصد کے لیے یہی لفظ قرآن کریم میں آیا ہے (زوجۃ یا زوجات کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا) فقہاء بھی التباس سے بچنے کے لیے بیوی کے لیے " زوجۃ " کا لفظ لیتے ہیں۔

۲:۱۸:۱(۱۱) [مُطَهَّرَةٌ] کا مادہ "ط ھ ر" اور وزن "مُفَعَّلَةٌ" ہے اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " طَھُرَ یطھُر طھارۃً " (باب نصر اور کرُم سے) آتا ہے اور اس کے معنی (جسمانی یا روحانی گندگی وغیرہ سے) "پاک صاف ہونا" ہیں۔ قرآن کریم میں اس فعل ثلاثی مجرد کا صرف ایک صیغہ ایک جگہ (البقرہ : ۲۲۲) آیا ہے۔ اور افعل التفضیل کا صیغہ (اطھر) چار جگہ آیا ہے۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے باب تفعیل سے (افعال کے صیغے) ۹ جگہ، باب تفعّل سے کچھ صیغے ۴ جگہ اور مصادر و اسماء مشتقہ کے مختلف صیغے دس جگہ وارد ہوئے ہیں۔ ان سب پر اپنی اپنی جگہ بات ہوگی۔ انشاء اللہ۔

● لفظ " مُطَھَّرَۃ " اس مادہ (طھر) سے باب تفعیل کا صیغہ اسم المفعول برائے مؤنث ہے۔ اس باب کے فعل " طَھَّرَ..... یُطَھِّرُ تَطھیرًا " کے معنی ہیں "......کو پاک کرنا" (جسمانی یا روحانی یا اخلاقی آلائش سے)۔ اس طرح " مُطَھَّرۃ " کے معنی " پاک صاف کی ہوئی" یا مطلقاً " پاکیزہ، پاک 'PURIFIED' یا PURE " ہیں۔ یہ لفظ (مطھّرۃ) قرآن پاک میں پانچ جگہ آیا ہے۔ جن میں سے تین جگہ " ازواج مطھرۃ " کی ترکیب (توصیفی) کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس ترکیب کا ترجمہ مختلف اردو مترجمین نے "پاک صاف کی ہوئی بیبیاں، پاک صاف بیبیاں، پاک بیویاں، ستھری عورتیں، صاف ستھری بیبیاں، پاکیزہ عورتیں اور پاکیزہ بیویاں" کی صورت میں کیا ہے۔ ان تمام تراجم میں " زن" یا " عورت " کا لفظ بھی " بیوی " ہی کے ہم

معنی آیا ہے۔ انگریزی مترجمین نے زیادہ تر لفظ SPOUSE اختیار کیا ہے جو "ازواج" کا موزوں مترادف ہے۔ فارسی مترجمین نے بیشتر تو "زنانِ پاک شدہ" یا "پاک کردہ شدہ" سے ترجمہ کیا ہے اور بعض نے "جفت ہائے پاک و پاکیزہ" سے ترجمہ کیا ہے یعنی "جوڑے" (جو ازواج کا لفظی ترجمہ ہے)۔ بہرحال ان تمام تراجم میں "بیوی" کا مفہوم صراحتًا یا اشارۃً موجود ہے۔ اور قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے اور کتب حدیث سے نہ صرف ان معنی کی تائید ہوتی ہے بلکہ اس آنے والی زندگی کے اس (جنسی) پہلو کے بارے میں بعض مزید تفصیلات بھی ملتی ہیں۔

● ہمارے بعض "روشن خیال" "مفکرین قرآن" کو آخرت کی زندگی کے انعامات میں "بیویوں" کے ذکر سے کچھ ایسی شرم آئی کہ انہوں نے اس ترکیب (ازواج مطہرۃ) کے معنی ہی توڑ مروڑ کر لغت اور نحو کے آسرے پر کچھ یوں نکالے کہ "ازواج" تو لغتًہ "میاں بیوی" (یا نر و مادہ) دونوں پر بولا جاتا ہے اور "مطھّرۃ" کی تانیث بھی عورتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ "جمع مکسر کی صفت عمومًا واحد مؤنث آتی ہے" کے اصول پر ہے۔ لھذا "ازواج مطھرۃ" کا ترجمہ "پاکیزہ جوڑے" ہونا چاہیے۔ اور چونکہ آیت میں "وَلَهُمْ" (اور ان مردوں کے لیے) بھی موجود ہے لہٰذا پاکیزہ جوڑے کی بجائے "پاکیزہ رفیق" سے ترجمہ کر کے اپنی دانست میں تو انہوں نے آخرت کی زندگی سے "بیوی" کا تصوّر نکال باہر کیا اور اس کی بجائے "COMRADE" (رفیق) کا "دلکش" تصوّر پیش کر دیا۔

● اور چلیے "ازواج مطھرۃ" (زیرِ مطالعہ لفظ) کی حد تک تو یہ منطق کچھ کام دے جاتی ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ قرآن کریم میں تو آخرت کے انعامات میں "بیویوں" کا ذکر کئی طریقوں سے اور متنوع الفاظ کے ساتھ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اور بعض جگہ ضمیر جمع مؤنث (ھُنَّ) کے ساتھ اور بعض خالص زنانہ صفات کے ساتھ ان کا ذکر آیا ہے (مثلاً دیکھئے الرحمٰن: ۵۶، الواقعہ: ۳۶ اور النبأ: ۳۳) — یہاں منکرین سنّت کو بھی اپنے خود ساختہ تصوّرات کا سہارا لے کر قرآن کریم میں مذکور ایسی "عورتوں" کو آنے والے دور کے قرآنی معاشرہ" کی "عالی مرتبت

© rasailojaraid.com

بیگمات " کہنا پڑا ۔ اور ان کے بارے میں بیان کردہ قرآنی صفات کے لیے بھی مادہ اور اشتقاق (لغوی) کے جنگل میں گھس کر (عربوں کے محاورہ اور استعمال کو برطرف رکھتے ہوئے) کسی اپنے مفید مطلب معنی کو گھسیٹ کر لے آئے اور اس سے اپنی مرضی کا یا " دور کی کوڑی " والا (FAR FETCHED) " مفہوم " نکال لیا ـــ مثلاً " اَبکاراً " (الواقعہ : ۳۶) = " اعلیٰ تربیت یافتہ " " عُرُباً " (الواقعہ : ۳۷) = " فصیح اللسان " " اترابا " (الواقعہ : ۳۷) " ہم مزاج ، ہم گل " " کَوَاعِبَ (النباء : ۳۳) = " شرف و مجد کے پیکر " وغیرہ ـــ محض زورِ قلم کے شیدائی مگر عربی زبان سے ناواقف لوگ ہی اس پر سر دھن سکتے ہیں ۔ ورنہ یہ کوئی ایسے لفظ نہیں ہیں جن کے معنی عربی معاجم (ڈکشنریوں) میں مل نہ سکتے ہوں یوں " کولمبس " بننے کی خواہش الگ بات ہے ۔ عربی زبان کے بین الاقوامی شہرت کے حامل پروفیسر عبدالعزیز المیمنی مرحوم ان " لوگوں " کی زبان کے ساتھ اس بازیگری کی بناء پر (جس کے مشاہدہ اور تجربہ کا موقع خود ان لوگوں کے ایک بڑے زعیم نے پروفیسر صاحب کو کراچی میں قیام کے دوران بہم پہنچایا تھا) کہا کرتے تھے : " ایسا لگتا ہے ان لوگوں کا مقصد " لغات القرآن " کو سمجھنا نہیں بلکہ ایک نئی زبان " تصنیف " کرنا ہے ۔ "

● بات یہ ہے کہ دنیا کو رہبانیت ، تجرد اور " برہم چریہ " جیسی ناقابل عمل اور غیر فطری تعلیم دینے والوں کے " اعتراضات " سے گھبرا کر ہمارے ان روشن خیال مفکرین کا " ازواج مطہرۃ " کی قسم کے الفاظ کے معنی کو توڑنے مروڑنے کے لیے " لغتِ قرآن " کے کونوں کھدروں میں چھپتے پھرنا ، نہ تو دین کی خدمت ہے نہ علم کی علامت ـــ ـــ اور آخرت کی زندگی میں عورتوں یا بیویوں کے ذکر سے گھبرانا اور شرمانا بھی یا تو بعض جاہلی اور غیر فطری مذاہب کی تعلیمات کے اثر کی وجہ سے ہے اور یا پھر محض فیشن اور منافقت ہے ۔ کیونکہ جنت (اور آخرت) میں زوجیت کے وجود کا قائل ہونے سے شرمانے والے یا اس پر اعتراض کرنے والے اکثر وہ لوگ ہیں جو کسی عورت سٹینو یا سیکرٹری کے بغیر نہ دفتر چلا سکتے ہیں نہ کاروبار ـــ وہ اس سواری میں سفر نہیں کر

سکتے جس میں کوئی من موہن "میزبان" (HOSTESS) نہ ہو — وہ اس مجلس کو مہذب نہیں سمجھتے جہاں بے حجاب اور بے باک عورتیں رونق افروز نہ ہوں — حتیٰ کہ وہ مرنے کے لیے بھی کسی ایسے ہسپتال یا نرسنگ ہوم کو منتخب کرتے ہیں۔ جس میں دم واپسیں تک خوشنما (SMART) نرسوں کے سرہانے موجود ہونے کا امکان ہو — ایسے لوگوں کو یہ کیوں کر زیب دیتا ہے کہ وہ قرآن میں "پاکیزہ بیوی" کے ذکر سے بھی چڑیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری حسی، ذہنی اور روحانی استعدادوں کی طرح جنسی استعداد اور اس کی "پاکیزہ تکمیل" بھی کامل اور مکمل انسان کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے اور اگر انسانی شخصیت (HUMAN PERSONALITY) کی لقاء کو تسلیم کرنا ہے تو اس کی پوری شخصیت (ENTIRELY, IN TOTALITY) کی لقاء کو ماننا پڑے گا۔ محض ایک ذہنی یا تجریدی (ABSTRACT) قسم کی لقاء تو اس کی تکمیل نہیں بلکہ اس میں ایک کمی ہے نقص ہے۔ اور اس بارے میں اسلام کا موقف بالکل معتدل اور حقیقت پسندانہ (REALISTIC) ہے۔ باقی تمام نظریات یا تو افراط و تفریط کا مظہر ہیں یا کسی نفسیاتی وہم (COMPLEX) کا نتیجہ۔

● اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ قرآن کریم میں آخرت کی جن نعمتوں اور لذتوں کا (یا جن سزاؤں اور دکھوں کا) ذکر آیا ہے ان کا معاملہ ایک لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان کی طرح ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کا بیان بشری محسوسات کے مطابق ہی کیا گیا ہے۔ مگر ساتھ "لیس کمثلہ شیئ" (الشوریٰ : ۱۱) کہہ کر ہر قسم کی مماثلت اور مشابہت کی بھی نفی کر دی گئی ہے — اسی طرح آخرت کی نعمتوں کے بیان سے بھی بنیادی طور پر تو ہماری اپنی بشری محسوسات ہی کی روشنی میں ایک تصور ابھرتا ہے مگر قرآن کریم میں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ یہ نعمتیں انسانی علم کی رسائی سے ماوراء ہیں۔ "فلا نعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین (.... السجدہ : ۱۷) اور اسی کی تفسیر میں صحیحین کی مرفوع حدیث میں آیا ہے۔ "اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا

© rasailojaraid.com

اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ (میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیز تیار کی ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا خیال تک آیا یا آ سکتا ہے)۔ تو جو چیز انسانی تخیل و تصوّر کی دسترس سے بھی ماوراء ہے اس کو اپنی دنیاوی نعمتوں اور لذتوں پر قیاس کرنا بھی غلط ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ آخرت کی نعمتوں (یا سزاؤں) کا جو ذکر قرآن کریم میں آیا ہے ان کی حقیقت ان الفاظ سے بھی قریب تر ہی ہوگی جن میں قرآن کریم نے ان کو بیان کیا ہے یا جس طرح صحیح احادیث میں ان کا بیان آیا ہے۔ تاہم اس کی اصل حقیقت امور غیبیہ (الغیب) میں سے ہے ہم اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں "آمنا بہ کل من عند ربنا" (آل عمران: ۷)۔ ان کی حقیقت نوعیت اور تفصیلات کا جاننا نہ ضروری ہے اور نہ ہی ممکن ۔ بھلا آپ چھ ماہ یا ایک سال کے بچے کو ان نعمتوں اور لذتوں یا دکھوں اور پریشانیوں کا تصور کیوں کر دے سکتے ہیں جن سے خود اس کو تیس چالیس سال کی عمر میں واسطہ پڑے گا۔

● اس کتاب میں ہمارا مقصد تفسیرِ قرآن کی باریکیوں میں جانا ہرگز نہیں۔ ہمارا اصل دائرہ "لغات و اعراب" ہی ہے۔ تاہم یہاں ہمیں اس بحث میں اس لیے الجھنا پڑا کہ یہاں "لغات" کے نام پر ہی "گھپلا" کرنے کا ایک نمونہ سامنے آیا۔ ___ اور اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی آدمی قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بے نیاز ___ بلکہ اس کا منکر ___ ہو کر قرآن کریم کو صرف زبان (لغت ونحو) کے زور پر سمجھنا چاہتا ہے اور وہ بھی اہل زبان کے محاورے اور استعمال کی بجائے صرف زبان کی مبتدیانہ معلومات کی بناء پر اور معجم (ڈکشنری) میں بیان کردہ مختلف معانی میں سے کسی ایک مفیدِ مطلب بات میں کھینچا تانی کر کے کچھ نہ کچھ نکال لانے پر تل جاتا ہے تو اس کے ذہن کی کجی (زیغِ قلب) کے باعث اس پر کیا کیا "انکشافات" ہوتے ہیں۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

● اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آخر یہ لوگ اس نئی معنی آفرینی سے کس کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی عربی دان یہودی یا عیسائی تو ان لوگوں کے اس معذرت خواہانہ (APOLOGETIC) جدید "مفہوم" کو قبول کر کے تعلیماتِ قرآن پر اعتراض کرنے سے باز نہیں آنے کا۔ عربی زبان سے ناواقف اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر و مخالف لوگ ہی ان "انکشافات" پر سر دھنیں تو دھنیں۔ اس قسم کے بعض مقامات آگے چل کر بھی ہمارے سامنے آئیں گے۔

[وهُم فِيهَا] = وَ (اور) + هم (وہ سب) + فِي (میں) + هَا (اس) کا مرکب ہے یہ سب الفاظ کئی بار گزر چکے ہیں۔ ترجمہ ہوگا "وہ سب اس میں ....."

۲ : ۱۸ : ۱ (۱۲) [خَالِدُونَ] (یہ اس لفظ کا رسم املائی ہے۔ رسمِ قرآنی پر آگے "الرسم" میں بات ہوگی)۔ اس لفظ کا مادہ "خ ل د" اور وزن "فَاعِلُونَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "خلَد یخلُد خُلُودًا و خُلْدًا (باب نصر سے) آتا ہے۔ اور "بَقِيَ اور دَامَ" کے معنی دیتا ہے یعنی "کسی جگہ ہمیشہ کے لیے رہنا۔ آخر تک رہنا۔ کسی جگہ مسلسل بسنا" ___ لفظ "خَالِدُونَ"

---

لہ ان لوگوں کی زبان کے ساتھ اس قسم کی دھاندلی کو یوں سمجھیے کہ مثلاً انگریزی کے لفظ "KIND" کے عام ڈکشنری میں کم از کم تین معنی تو موجود ہیں یعنی (۱) مہربان (۲) قسم اور (۳) جنس یا سامان (بمقابلۂ "نقد" مثلاً)۔ اب اگر کوئی آدمی کسی عبارت میں ان تینوں میں سے ایک مقررمعنی ہی مراد لینا چاہے (قطع نظر اس بات کے کہ عبارت اسے قبول کرتی ہے یا نہیں) اس لیے کہ وہ معنی ڈکشنری میں بہرحال موجود ہے تو کیا اہل زبان ایسے آدمی کو احمق نہیں کہیں گے؟ کسی عبارت میں کسی لفظ کے معنی (مراد) کو اہل زبان کا محاورہ اور سیاق و سباق متعین کرتا ہے نہ کہ صرف ڈکشنری۔ یا اس کے [illegible] اور قرآن کریم کے معاملے میں تو متواتر معنی کو مقدم رکھنا بھی ضروری ہے۔

© rasailojaraid.com

(جو "خالدٌ" کی جمع مذکر سالم ہے) اس فعل مجرد سے اسم الفاعل کا صیغۂ جمع ہے اور اس کے لفظی معنی تو ہیں "ہمیشہ رہنے والے، بسنے والے"۔ اردو کے بعض مترجمین نے تو اسی طرح تحت اللفظ ترجمہ ہی کیا ہے۔ مگر اکثر نے اردو محاورے کا لحاظ رکھتے ہوئے "ہمیشہ رہیں گے" یا "ہمیشہ کے لیے ہوں گے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ جو محاورہ اور مفہوم کی بناء پر ہی درست ہے ورنہ بظاہر تو یہ "خالدون" کی بجائے "یخلدون" کا ترجمہ لگتا ہے۔

● اس فعل مجرد (خلَد یخلُد) سے فعل کے صرف دو صیغے اور مزید فیہ کے بابِ افعال سے بھی فعل کے صرف دو ہی صیغے قرآن کریم میں آئے ہیں۔ البتہ ثلاثی مجرد اور مزید فیہ کے بعض مصادر اور اسماء مشتقہ ۸۰ سے زائد جگہ آئے ہیں۔ جن میں زیادہ لفظ "خالدٌ" اور اس کے تثنیہ اور جمع سالم کے صیغوں کی ہے۔

---

## بقیہ، رودادِ اجلاس

(iv) اجتماع نماز عصر کے متصلاً بعد شروع ہوگا جس میں باہمی تعارف اور تبادلۂ خیال کے ساتھ ساتھ اراکین کی تواضع Light Refreshment سے کی جائے گی۔ (اس میں سادگی کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے)

(v) بعد نماز مغرب محترم صدر مؤسس کا درسِ قرآن ہوگا جس میں شرکت کے لئے اراکین انجمن کے علاوہ دیگر احباب اور اس علاقہ کے مکین بھی مدعو کئے جائیں گے۔

(vi) درس قرآن کی یہ محفل میزبان کی رہائش گاہ پر بھی منعقد کی جاسکے گی اور اگر قریب کی مسجد میں مناسب بندوبست ہو سکے تو یہ بات زیادہ پسندیدہ ہوگی۔

(vii) اس اجتماع کے لئے اخبار میں ایک اشتہار دیا جائے گا۔ اس پر اندازاً ۲۰۰۰/۰۰ روپے خرچ ہوں گے جو میزبان کے ذمہ ہوں گے (اس ضرورت کا احساس سالانہ اجلاس کے بعد ہوا ہے)

خطاب کے اختتام پر محترم صدر مؤسس نے دُعا فرمائی اور ناظمِ اعلیٰ نے شرکائے محفل کو اللہ حافظ کہا۔

○○○

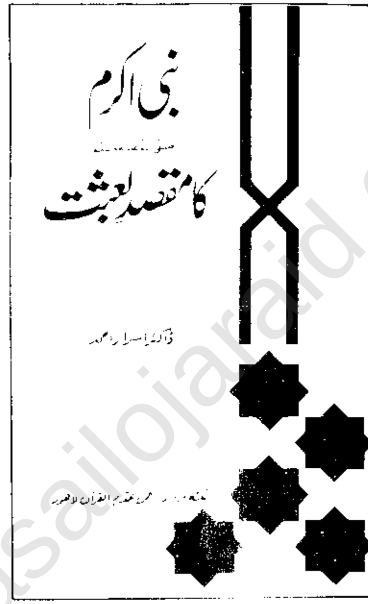


اشاعت خاص -/۲۰ روپے، عام -/۶ روپے

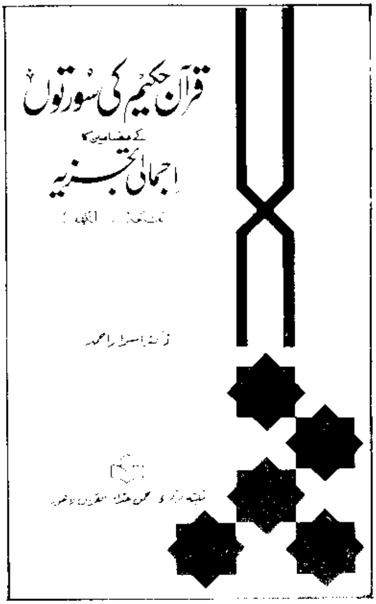


اشاعت خاص -/۴۰ روپے، عام -/۲۰ روپے

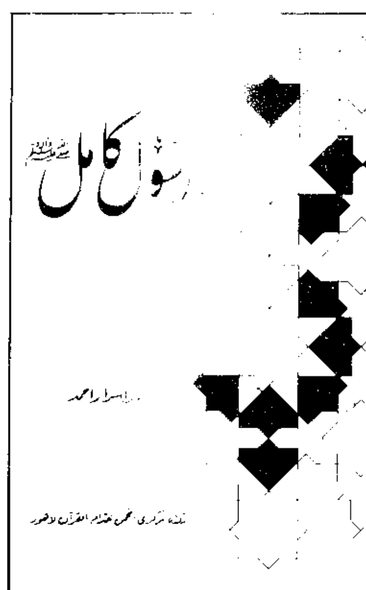


اشاعت خاص -/۱۲ روپے، عام -/۵ روپے

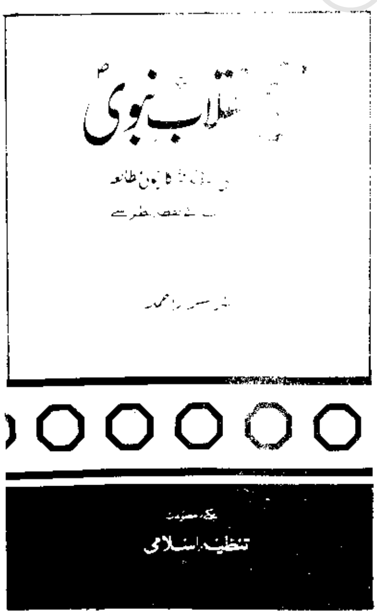


اشاعت خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

© rasailojaraid.com

JUNE 1991 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 10
NO. 6

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاهور

کے قیام کا مقصد

**منبعِ ایمان —— اور —— سرچشمۂ یقین**

**قرآنِ حکیم**

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

**اسلام کی نشأۃِ ثانیہ —— اور —— غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

© rasailojaraid.com